اَلقُدس

پس منظر اور صہیونی عزائم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کتاب: القدس۔پس منظر اور صہیونی عزائم

مصنف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی۔کراچی
(ادارہ معارفِ اسلامی۔کراچی)
Email: irak.pk@gmail.com
Website: www.irak.pk

تقسیم کنندہ: اکیڈمی بک سینٹر (A.B.C.)
ڈی۔۳۵'بلاک۔۵'فیڈرل بی ایریا
کراچی۔۷۵۹۵۰
فون:۳۶۳۴۹۸۴۰۔۳۶۸۰۹۲۰۱(۰۲۱)

اشاعت: شوال المکرم ۱۴۳۵ھ ۔ اگست ۲۰۱۴ء

قیمت: ۳۰روپے

پیش لفظ

فلسطین کی عبوری انتظامیہ کے ''صدر'' یاسر عرفات نے اعلان کر رکھا تھا کہ اگر اسرائیل سے کوئی معاہدہ نہ ہوا' تب بھی وہ ۱۵ ستمبر ۲۰۰۰ء کو خود مختار و آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیں گے۔ لیکن جیسا کہ اندازہ تھا' وہ یہ کام نہ کر سکے۔ اب تو مسئلۂ فلسطین کے حل کے لیے امریکی ''روڈ میپ'' بھی آ چکا ہے اور جناب یاسر عرفات قصۂ ماضی بنا دیے گئے ہیں۔ مغربی استعمار نے فلسطین کا سودا کرنے کے لیے محمود عباس نامی ایک ''بہائی'' کو فلسطین کی عبوری انتظامیہ کا ''وزیر اعظم'' بنوا دیا ہے۔ لیکن تا حال ان سے بھی کوئی معاملہ بنتا نظر نہیں آ رہا۔ اسرائیل کا اصرار ہے کہ بیت المقدس اس کے زیر انتظام رہے گا اور فلسطینیوں کا مطالبہ ہے کہ کم از کم اس کے مشرقی حصہ پر (جو ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اردن کے ہاتھوں سے نکل کر اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا تھا) فلسطینی کنٹرول ہونا چاہیے۔ اسی مشرقی بیت المقدس میں تقریباً ۳۵ ایکڑ پر مشتمل وہ خطۂ زمین ہے جو حرم الشریف کے نام سے موسوم ہے اور جس کی حدود میں مسجد الاقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ (پتھر والا گنبد) واقع ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے نبیٔ آخر الزماں ﷺ نے معراجِ سمٰوٰت کا عظیم سفر کیا تھا اور جس کی طرف رخ کر کے خود نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ تقریباً ۱۵ سال تک نماز ادا کرتے رہے۔ اسی لیے اس کو قبلۂ اول کہا جاتا ہے۔ دنیا کی صرف تین مسجدوں کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کے لیے خصوصی طور پر جانا اور اُنہیں دوسری تمام مساجد پر فوقیت دینا جائز ہے۔ یہ تین مسجدیں کعبۃ اللہ' مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ ہیں۔

۲۸ ستمبر ۲۰۰۰ء کو اسرائیلی انتہا پسند جماعت لیکوڈ پارٹی کے سربراہ (بعد میں اسرائیلی وزیر اعظم) ایریل شیرون نے حرم الشریف (مسجدِ اقصیٰ) کا دورہ کیا' جس پر فلسطینی مسلمانوں نے پُرامن احتجاجی مظاہرے کیے۔ اسرائیلی فوجیوں نے مظاہرین کو گولیوں سے بھون دیا۔ اس کے بعد سے پورا فلسطین ایک بھٹی کی مانند سلگ رہا ہے۔ اسرائیلی اس بات پر بضد ہیں کہ مسجدِ اقصیٰ کی حدود میں ہیکل سلیمانی ضرور تعمیر کریں گے۔ دوسری طرف یہودیوں کو اس بلا جواز کارروائی سے روکنے کے لیے مسلمان بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ اب تک کئی ہزار افراد اسرائیلی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن چکے اور ہزار ہا

مکانات مسمار کیے جا چکے ہیں اور نہیں معلوم کہ یہ سلسلہ کہاں تک پہنچے گا۔ پوری دنیا کی نگاہیں بیت المقدس میں جاری کشمکش پر مرتکز ہیں۔

دریں حالات ہمارے ہاں امریکی اشارے پر اور ریاستی اداروں پر قابض طاقتور حلقوں کی آشیرواد سے یہ بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ہمارا اسرائیل سے کیا جھگڑا ہے۔ اب تو بہت سی عرب حکومتوں نے بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے یا کرنے والی ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ عربوں نے کب ہمارا ساتھ دیا کہ اب بھی ہم ان کی وجہ سے اسرائیل سے دشمنی مول لیے رہیں۔ اُس سے ہماری دشمنی کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ اسرائیل اور بھارت دوست بنے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اسرائیل کو تسلیم کر لیں تو ہم بھی اس کے دوست بن سکتے اور بھارت سے اس کی قربت کو کم کر سکتے ہیں۔

یہ دلائل سادہ دل اور معاملے کے تاریخی، واقعاتی، ایمانی، اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں سے ناواقف لوگوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا معاملہ محض ایک ملک کو ماننے نہ ماننے کا نہیں۔ اسرائیل یہودیوں کا جبری طور پر حاصل کردہ نسلی وطن اور عالمگیر صہیونی تسلط کا نقطۂ پرکار ہے۔ حق و باطل کی ازلی کشمکش میں سے پچھلے ۳۔۴ ہزار سال کے سیکڑوں خم دار پہلو اس سے وابستہ ہیں، جنھیں ہوش و حواس میں رہنے والا کوئی باغیرت مسلمان نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مسئلۂ فلسطین کی نزاکت اور اس کے ایمانی پہلوؤں سے ہی نہیں، واقعاتی اور تاریخی حقائق سے روشناس ہونے کے لیے بھی زیرِ نظر کتابچہ نہایت مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔

بیت المقدس کی اہمیت اور اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اس پر اسرائیلی اور عرب دعووں میں حقیقت کتنی ہے؟ اور اس حوالے سے صہیونی عزائم اور منصوبے کیا کیا ہیں؟ ان سوالوں کے مختصر اور جامع جواب پر مبنی ایک عمدہ خطاب حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء کو لاہور میں اُس وقت کیا تھا، جب یہودی سازش کے تحت ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو مسجدِ اقصیٰ شہید کر دی گئی تھی۔ اگرچہ کہ ۴۳ سال گزر چکے اور عالمی حالات میں بعض تغیرات بھی آ چکے ہیں۔ مگر سید مودودی (خدا کی رحمتیں ہوں ان پر) کا وہ خطاب آج بھی نہایت معلومات افزا، بصیرت افروز اور چشم کشا ہے۔ تازہ ترین حالات کے پس منظر میں سید مودودی کا وہ خطاب آپ بھی پڑھیئے۔

سید شاہد ہاشمی

ایگزیکٹو ڈائریکٹر، اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

القدس: پس منظر اور صہیونی عزائم

مسجدِ اقصیٰ میں آتشزنی کی دلخراش خبر ہر مسلمان کے قلب وروح پر بجلی بن کر گری ہے اور صرف پاکستان ہی کے مسلمان نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمان اس پر تڑپ اٹھے ہیں۔ اس وقت بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ایک طوفان کی طرح اٹھ رہا ہے کہ آخر اس مصیبت کا علاج کیا ہے؟ یہ ہماری تاریخ کے نازک ترین لمحات میں سے ایک لمحہ ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ منحوس لمحہ ہماری زندگی میں پیش آیا۔ ستر پچھتر کروڑ مسلمان دنیا میں موجود ہیں (۱۹۶۹ء) اور پھر بھی یہودیوں کی یہ ہمت ہوئی کہ ہماری تین مقدس ترین مسجدوں میں سے ایک کو آگ لگا دیں۔ اُس مسجد کو پھونک ڈالیں جسے اسلام میں قبلۂ اول ہونے کا شرف حاصل ہے، جس کی طرف رخ کر کے رسول اللہ ﷺ نے ساڑھے چودہ برس تک نماز پڑھی ہے اور جس سے حضورؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس سے بڑی مصیبت امتِ مسلمہ کے لیے اور کیا ہوسکتی ہے؟ جس مسلمان کے دل میں دین کی ادنیٰ رمق بھی باقی ہے، وہ سوچ رہا ہے کہ یہاں تک نوبت پہنچ جانے کے بعد بھی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو دنیا میں اس امت کی کیا آبرو باقی رہ جائے گی اور اس کے بعد ہمیں نہ معلوم اور کیسی ذلتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اس نازک موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس معاملہ کی پوری نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں، کیونکہ اسے سمجھے بغیر ہم صحیح طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

اس جُرم کا اصل مُحرِّک کیا ہے؟

اسرائیل نے اس واقعے کے بعد مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی پے در پے کوششیں کی ہیں اور اس کے لیے بڑے اوچھے طریقے اختیار کیے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ بجلی کے تاروں میں خرابی واقع ہونے سے اتفاقاً آگ لگ گئی۔ لیکن پھر خود ہی ان

مجرموں نے یہ محسوس کرلیا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔اتنی بڑی عمارت میں محض بجلی کے تاروں کی خرابی سے ایسی خوفناک آتش زدگی آخر کیسے ہوسکتی ہے؟ اس کے بعد نہایت ڈھٹائی اور سخت بے حیائی کے ساتھ یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ عربوں نے خود آگ لگائی ہے۔اس طرح کے جھوٹ کا ہم کو پہلے ہی کافی تجربہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ کس قماش کے لوگ ایسے جھوٹ گھڑا کرتے ہیں۔اس فلسفے کے اصل مصنف یہودی ہی ہیں۔وہ یہودی دماغ ہی تھا جس نے اخلاق کا یہ اصول تصنیف کیا تھا کہ جس طریقہ سے بھی مقصد براری ہوسکے وہ برحق ہے۔یہودیوں کو بہت جلدی یہ محسوس ہوگیا کہ یہ دروغِ بےفروغ بھی کارگر نہ ہوگا۔اب ایک آسٹریلین نوجوان کوانہوں نے پکڑلیا ہے اور دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس دیوانے نے کسی جنون کے دورے میں یہ حرکت کرڈالی ہے' ورنہ مسجدِ اقصیٰ کومنہدم کرنے کا کوئی منصوبہ اسرائیل کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نوجوان پر مقدمہ چلاکر اور اپنے ایک خودساختہ کمیشن کے ذریعہ سے تحقیقات کرا کے وہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کی پوری تاریخ بیان کردوں' جس سے آپ کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہ ایک بڑا طویل المیعاد منصوبہ ہے' جوصدیوں سے چل رہا ہے اور اسی کے تحت یہ کارروائی بطورِ تمہید کی گئی ہے۔

یہودی عزائم کی تاریخ

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل از مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دوصدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہوگئے تھے۔وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے' جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتلِ عام کرکے اس سرزمین پر اُسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (Red Indians) کوفنا کرکے امریکا پر قبضہ کیا۔اِن کا دعویٰ تھا کہ خدا نے یہ ملک اِن کی میراث میں دیدیا ہے' اس لیے اِنہیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل

کر کے بلکہ اُن کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔

اس کے بعد آٹھویں صدی قبل از مسیح میں اَسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ پھر چھٹی صدی قبل از مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلا وطن کر دیا' بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی' اور ہیکلِ سلیمانی (Temple of Solomon) کو جسے دسویں صدی قبل از مسیح میں حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا' اس طرح پیوندِ خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلا وطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کی' لیکن یہ دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے زیادہ دراز نہ ہوا۔ ۷۰ء میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی' جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور ہیکلِ سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر ۱۳۵ء میں رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اِخراج کے بعد جنوبی فلسطین میں بھی اسی طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عرب قوموں سے آباد تھا' بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے قانوناً ممنوع کر رکھا تھا اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔ اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ:

۱) یہودی ابتداً نسل کُشی (Genocide) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

۲) شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک وہ آباد رہے۔

۳) جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔ اور

۴) عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل از مسیح میں انہوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکلِ سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات بیس صدیوں سے بٹھائی جارہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمہیں واپس ملنا ہے اور تمہارا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکلِ سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔

بارہویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimonides) نے اپنی کتاب شریعتِ یہود (The Code of Jewish Law) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکلِ سلیمانی کو ازسرِ نو تعمیر کرے۔ مشہور فری میسن تحریک (Freemason Movement) بھی، جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں، اصلاً ایک یہودی تحریک ہے، اور اس میں بھی ہیکلِ سلیمانی کی تعمیرِ نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے۔ اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈرامہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکلِ سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکلِ سلیمانی کو تعمیر کرے اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں ہیکلِ سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا' اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی مَعبَد نہ تھا' بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسجد الاقصیٰ اور قُبۃ الصخرۃ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی مَعبَد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انہوں نے پھر انہیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے' ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم و ستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوارِ گریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی مقدس یادگار سمجھتے ہیں' یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انہیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیلی حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن (News From Israel) شائع ہوتا ہے۔ اس کی یکم جولائی ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوارِ گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ سولہویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔ لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ وہ مسلمانوں کی شرافت' فیاضی اور حسنِ سلوک کا بدلہ آج اِس شکل میں اُن کو دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ اِن ظالموں نے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی

کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوااور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔ اس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرٹزل (Theodore Hertzel) نے ۱۸۹۷ء میں صہیونی تحریک (Zionist Movement) کا باقاعدہ آغاز کیا۔اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکلِ سلیمانی تعمیر کی جائے۔یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لیے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان وہاں زمینیں خریدیں اور منظم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں۔پھر ۱۹۰۱ء میں ہرٹزل نے سلطان عبدالحمید خان' سلطانِ ترکی کو باقاعدہ یہ پیغام بھجوایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں' آپ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔مگر سلطان عبدالحمید خان نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ ''جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے' اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں''۔جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اس کا نام تھا حاخام قرہ صو آفندی۔ یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرات کی کہ سلطانِ ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالہ کرنے کا مطالبہ پیش کرے۔اسی پر بس نہیں' بلکہ سلطان عبدالحمید خان کا جواب سن کر ہرٹزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دیدی گئی کہ تم اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد ہی سلطان عبدالحمید خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہوگئیں' جن میں فری میسن' دُونمہ [1] اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترک قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں پختہ ہو کر اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سلطان عبدالحمید کو معزول

کر دیں۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۸ء میں جو تین آدمی سلطان عبدالحمید کی معزولی کا پروانہ لے کر ان کے پاس گئے تھے ان میں دو ترک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرہ صوآ فندی تھا، جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات برس ہی پہلے اسی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہوگی جب وہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

ترک اور عرب قوم پرستی کا تصادم

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور و شور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی کی عثمانی سلطنت کے ٹکڑے اڑانا تھا۔ اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتدا سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بِنا اسلامی اخوت کے بجائے ترک قوم پرستی پر رکھیں، حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے، بلکہ عرب اور کرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترک قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عرب قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے، بیروت اس کا مرکز تھا اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں ابھاری گئیں اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے، دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

جنگِ عظیم اوّل اور اعلان بالفور

پہلی جنگ عظیم میں ابتداً یہودیوں نے حکومتِ جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا' کیونکہ جرمنی میں اس وقت یہودیوں کا اتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکا میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے قیصر وِلیم (Kaiser Wilhelm) سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوا دے گا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا' وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائز مین (Dr.Weisman) آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت و قابلیت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آ سکتی ہے' اگر آپ ہم کو یہ یقین دلا دیں کہ آپ فتحیاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیں گے۔ ڈاکٹر وائز مین ہی اُس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کر لیا جو اعلانِ بالفور (Balfour Declaration) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی ایک خودمختار ریاست بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے شریف حسین (حجاز کے حکمراں) کو تحریری وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریزی قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے کلنک کے اِس ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔

پھر ذرا غور کیجیے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کر دینے کا وعدہ کیا جا رہا تھا؟ وہاں دو ڈھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آ رہی تھی۔ اعلانِ بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پوری ۵ فیصد بھی نہ تھی۔ ایسے ملک کے متعلق سلطنتِ برطانیہ کا وزیر خارجہ (لارڈ بالفور) یہ تحریری وعدہ

دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں دوسری قوم کا وطن بنایا جائے گا‘ جو دنیا بھر میں انیس سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمہیں موقع دیں گے کہ عربوں کے جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے‘ اس سے تم انہی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لاکر بسا دو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اس خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے: ”ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صہیونیت ہمارے لیے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصّبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس قدیم سرزمین میں اس وقت آباد ہیں“۔ اُس وقت کے برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (Documents of Birtish Policy) کی جلد دوم میں ثبت ہیں۔

مجلس اقوام کی کارگزاری

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۳۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں ”مجلسِ اقوام“ (League of Nations) اور اس کی اصل کارفرما دو بڑی طاقتوں‘ برطانیہ اور فرانس نے بالکل اس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں‘ بلکہ محض صہیونی تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلسِ اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے اِنتداب[۲] (Mandate) میں دے دیا جائے۔ اُس موقع پر فلسطین میں مردم شماری کرائی گئی تھی۔ اُس کے مطابق مختلف اقوام کا آبادی میں یہ تناسب تھا:

اقوام	تعداد	تناسب
مسلمان عرب	۶,۶۰,۶۴۱	۸۱ فیصد
عیسائی عرب	۷۱,۴۶۴	۹ فیصد

یہودی	۷۹۰,۸۲	۱۰ فیصد
کُل	۸۹۵,۱۴,۸	۱۰۰ فیصد

یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جا کر آباد ہو رہے تھے[۳]۔ اس پر بھی مجلسِ اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ یہ اس کی ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے، صہیونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کر کے اسے نظم و نسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (Civil) حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ یہ تھا اُس مجلسِ اقوام کا انصاف، جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا، لیکن ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام ہی تذکرہ کر دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسِ اقوام میں یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے، جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی اِنتداب کا کارنامہ

یہ اِنتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیموئیل خود ایک یہودی تھا۔ صہیونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم و نسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سپرد نہ صرف تعلیم اور زراعت کے محکمے کیے گئے، بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے، سفر اور قومیت کے معاملات بھی اس کے حوالے کر دیے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ مزید براں ان کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقاوی اور دوسری سہولتوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں

پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر ہر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کردیں۔ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نو آبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام قیمت لے کر پٹے پر دے دیے گئے۔بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے عرب گاؤں صاف کردیے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو آٹھ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو پچاس ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کردیا گیا اور ان کو فی کس تین پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کردیا گیا۔ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ بیاسی ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صہیونیت کی خدمت انجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں، جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگِ عظیم دوم (۱۹۳۸۔۴۴ء) کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔صہیونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنہوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کردی۔انگریزی اِنتداب کی ناک کے نیچے یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے۔مگر قانون صرف عربوں کے لیے تھا جو انہیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخ دل تھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا، جس میں وہ اس قابل ہوگئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا ''قومی وطن'' بنانے کے بجائے فلسطین میں ان کی ''قومی ریاست'' قائم کردیں۔

”قومی وطن“ سے ”قومی ریاست“ تک

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوامِ متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلسِ اقوام (League of Nations) نے صہیونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اُس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین ”مجلسِ اقوامِ متحدہ“ (United Nations Organization) انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں امن و انصاف کے قیام کی علمبردار بن کر اٹھی تھی، اس نے فلسطین میں کیا انصاف قائم کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخرکار امریکا نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہیٹی، فلپائن اور لائبیریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکی کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے اور جیمز فوریسٹال (Forrestal) اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ”اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی (Scandal) کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔“

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی، اس کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فیصدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو، اور ۴۵ فیصدی رقبہ ۶۷ فیصدی عرب آبادی کو دیا گیا، حالانکہ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فیصدی حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوامِ متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں جو مظالم

عربوں پر کیے گئے' آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب (A Study of History) میں کہتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔ دیر یاسین میں ۹ اپریل ۱۹۴۸ء کے قتلِ عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے' جس میں عرب عورتوں' بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا' عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ ''ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے' اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ''۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس میں رمق برابر بھی شرافت و انسانیت موجود ہو؟

ان حالات کے دوران ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عین اس وقت جب کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر پھر بحث کر رہی تھی' یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور سب سے پہلے امریکا اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا' حالانکہ اس وقت تک اقوامِ متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک چھ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل برخلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاستِ اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں۔ لیکن یہودی اس وقت تک اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا' اس وقت فلسطین کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصہ یہودیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر کے دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے' اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ

کے لیے چیکوسلوواکیہ سے آئے تھے۔ اقوامِ متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں ہوئیں، ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام، دونوں کے علمبردار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ

اس کے بعد یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا جو ۱۹ سال کے اندر جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بیت المقدس اور باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحدِ شام کی بالائی پہاڑیوں (جولان) پر اسرائیل کے قبضے سے تکمیل کو پہنچا۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷,۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہوگیا اور چودہ پندرہ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن گئے۔ اس مرحلے میں اسرائیل کے منصوبے کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر امریکا اس کا حامی و مددگار اور پشت پناہ بنا رہا۔ برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ممالک بھی اپنی اپنی حد تک اس کی تائید و حمایت کا پورا حق ادا کرتے رہے۔ روس اور اس کا مشرقی بلاک بھی کم از کم ۱۹۵۵ء تک اعلانیہ اس کا حامی رہا اور بعد میں اس نے اگر اپنی پالیسی بدلی بھی تو وہ عرب ملکوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے اسرائیل ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں جب عرب ممالک اس بات سے بالکل مایوس ہوگئے کہ امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں سے ان کو اسرائیل کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار مل سکیں گے تو انہیں مجبوراً اشتراکی بلاک کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس بلاک کے ملکوں نے اس لالچ میں ان کو ہتھیار دینے شروع کیے کہ اس طرح انہیں عرب ممالک میں اشتراکیت پھیلانے اور ان کو اپنے دائرۂ اثر میں لانے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے نتیجے میں یہ تو نہ ہوسکا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجاتے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ روس کو مصر و شام سے یمن اور الجزائر تک اپنے اثرات پھیلانے کا موقع حاصل ہوگیا اور عرب ملکوں میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش اتنی بڑھی کہ اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے۔

انیس برس کی اس مدت میں امریکا نے اسرائیل کو ایک ارب ساٹھ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی۔ مغربی جرمنی سے اس کو ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا تاوان دلوایا گیا اور دنیا بھر کے یہودیوں نے دو ارب ڈالر سے زیادہ چندے دے کر اس کی مالی پوزیشن مضبوط کی۔ جنگی حیثیت سے اس کو زفرق تا بقدم اس قدر مسلح کر دیا گیا کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو پیٹ لے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکا اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوامِ متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ نومبر ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک اقوامِ متحدہ کی ۲۸ قراردادیں وہ اس کے منہ پر مار چکا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء سے نومبر ۱۹۶۶ء تک سات مرتبہ اقوامِ متحدہ نے اس کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس کیں، مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا تو اُس وقت اسرائیل کے وزیرِ اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ ''اگر اقوامِ متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے، تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقوں سے نہیں نکلیں گے۔'' یہ سب کچھ اسی

ا۔ ٹھیک یہی مضمون ہے ایک حدیث کا، جس میں نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

مَنْ نَظَرَ فِیْ دِیْنِہٖ اِلٰی مَنْ ھُوَ فَوْقَہٗ فَاقْتَدٰی بِہٖ وَنَظَرَ فِیْ دُنْیَاہُ اِلٰی مَنْ ھُوَ دُوْنَہٗ فَحَمِدَاللّٰہَ عَلٰی مَافَضَّلَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ کَتَبَہُ اللّٰہُ شَاکِراً صَابِراً. وَّمَنْ نَظَرَ فِیْ دِیْنِہٖ اِلٰی مَنْ ھُوَ دُوْنَہٗ وَنَظَرَفِیْ دُنْیَاہُ اِلٰی مَنْ ھُوَ فَوْقَہٗ فَاَسِفَ عَلٰی مَافَاتَہٗ مِنْہُ لَمْ یَکْتُبْہُ اللّٰہُ شَاکِراً وَّلَا صَابِراً. (ترمذی)

''جس نے اپنے دین کے معاملہ میں اپنے سے اوپر والے پر نظر رکھی اور اس کی پیروی میں آگے بڑھا، اور اپنی دنیا کے معاملے میں اپنے سے کم تر کو دیکھا اور اللہ کے دیئے ہوئے فضل پر اس کا شکر ادا کیا، وہ اللہ کے ہاں شاکر اور صابر لکھا گیا۔ (بخلاف اس کے) جس نے اپنے دین کے معاملے میں اپنے سے کم تر اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے برتر پر نظر رکھی، اور دنیا پانے میں جو کمی رہ گئی اس پر حسرت و اندوہ میں مبتلا ہوا، وہ اللہ کے ہاں نہ شاکر لکھا گیا نہ صابر''۔

وجہ سے ہے کہ امریکا اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھوکر مارتا ہے اور پوری اقوامِ متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکا کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے' اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اس رویے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیئر مین جنرل وہیلر نے صدر لنڈن بی جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے سربراہ رچرڈ ہیلمس (Helms) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اسرائیل پر ''وحی'' نازل [ہ] ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب موقع آ گیا ہے۔ اس پر بھی امریکی چھٹا بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے سواحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تا کہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد سنڈے ٹائمز لندن نے ایک کتاب شائع کی تھی' جس کا نام تھا The Holy War-June 1967 اس کا جو باب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے' اس کا عنوان رکھا گیا ہے Back After 896 Years' یعنی ''۸۹۶ برس بعد واپسی''۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا' نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں کا ہی ایک حصہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال بھی یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ

ہونے والا تھا' اسی کی رات کو روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا۔ عربوں کے ساتھ روس کے رویے پر یوگوسلاویہ کے ایک سفارت کار کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ ''ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے۔'' یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہو گیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین ان کے ہاتھ آ گیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے' جس کے لیے وہ دو ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ نوے سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزا دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد الاقصیٰ اور قُبّۃ الصخرۃ کو ڈھا کر ہیکلِ سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے' کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقاماتِ مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ اُس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزا کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جز کا تعلق ہے' اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامل کرتا رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکا کو دنیائے اسلام کے شدید ردعمل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیر نو اُن کا مسیح ہی آ کر کرے گا۔ جب تک وہ نہ آ جائے' ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔[۵] یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔ دوسرا گروہ جو جدّت پسند ہے' اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں' کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوارِ گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دورِ مسیحائی (Messianic

(Era) میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربّی[6] (Chief Rabbi) نے تورات ہاتھ میں لے کر اُس روز کہہ دی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوارِ گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔اس کے الفاظ یہ تھے کہ ''آج ہم ملتِ یہود کے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں''۔ انہی دو وجوہ سے مسجدِ اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِعمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جز اس منصوبے کا یہ ہے کہ ''میراث کے ملک'' پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا ملک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

''اے اسرائیل، تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔''

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس نے کھلم کھلا دوسری قوموں کے ممالک پر قبضہ کرنے کا ارادہ عین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صہیونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے اس کی رو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی علاقہ، اور جگر تھام کر سنئے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے، اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردِعمل بھی مسجدِ اقصیٰ کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ موثر ثابت نہ ہوسکا، تو پھر خاکم بدہن ایک دن ہمیں وہ بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں گے۔

پس چہ باید کرد؟

اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیش نظر مسئلے کی پوری نوعیت، نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے چند باتیں بخوبی واضح

ہوجاتی ہیں:

اول یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور ان کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیر کے امکانات نظر نہیں آتے۔خصوصاً امریکا کی پشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم یہ کہ اقوام متحدہ قراردادیں پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کرسکتی۔اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقت اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ پچھلے بائیس سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کردی ہے۔

(ایک بار پھر واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۶۹ء میں کیا گیا تھا۔ ناشر)

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجدِ اقصیٰ، بلکہ مدینہ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدّسہ کو مستقل طور پر محفوظ کردینے کے لیے مجتمع کی جائے۔اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے ہیں کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے، مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں، یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔اب مسجدِ اقصیٰ کے سانحہ کے بعد، خدا کا شکر ہے کہ ان کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ صہیونیت کی عظیم بین الاقوامی سازش کا مقابلہ۔۔۔ جب کہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید وحمایت بھی اس کو حاصل ہے۔۔۔تنہا عربوں کے

بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ساٹھ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ستّر پچھتر کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں اور ان کی تیس بتیس حکومتیں اس وقت (۱۹۶۹ء) انڈونیشیا سے مراکش اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے کو حل کر لینا' ان شاء اللہ کچھ زیادہ مشکل نہ ہو گا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو'اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلانِ بالفور (Balfour Declaration) سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے' صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں' انہیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور ظلم و جبر کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا ''قومی وطن'' بنایا' پھر اسے ''قومی ریاست'' میں تبدیل کیا اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا' بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا ہے کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی ایک کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے۔ عالمِ اسلام کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اس کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔ فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بننی چاہیے' جس میں ملک کے پرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عرب عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو ''قومی وطن'' اور پھر ''قومی ریاست'' بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکا۔۔۔ جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر' ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے۔۔۔ تو اب وقت آ گیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اُس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو روئے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اُس کے لیے کوئی ادنیٰ درجہ کا بھی جذبۂ خیر سگالی باقی رہ جائے۔ اب وہ خود فیصلہ کر لے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔

حواشی

۱۔ یہ وہ یہودی تھے' جنہوں نے ریاکارانہ اسلام قبول کر رکھا تھا۔ ترک ان کو دُونمہ کہتے ہیں۔

۲۔ اِنتداب کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت بطورِ خود کسی ملک کی فرماں روائی نہیں کر رہی ہے' بلکہ مجلسِ اقوام کی طرف سے اس کے سپرد کام کیا گیا ہے کہ وہ وہاں خاص شرائط کے تحت فرماں روائی کرے۔

۳۔ ۱۹۱۷ء میں یہودی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی۔ پانچ سال کے اندر وہ بڑھ کر ۸۳ ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

۴۔ اس لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیاطین بھی اپنے اولیاء پر ''وحی'' کیا کرتے ہیں۔

۵۔ واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں' مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک اپنے ''مسیحِ موعود'' (Promised Messiah) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ ''مسیحِ موعود'' وہی ہے جسے روایات میں رسول اللہ ﷺ نے مسیحِ دجّال قرار دیا ہے۔

۶۔ جس طرح ہماری فوج کے ساتھ پیش امام ہوتے ہیں' اسی طرح یہودی فوج کے ساتھ ربّی (Rabbi) ہوتے ہیں' اور ان کے چیف ربّی کو اسرائیلی فوج میں بریگیڈیئر جنرل کا رینک حاصل ہوتا ہے۔